کتاب نما

۱- پاکستان میں نفاذ اسلام: ۴۴۴ صفحات - قیمت ۱۲۰ روپے
۲- پاکستان' بھارت اور عالم اسلام: ۴۷۱ صفحات - قیمت ۸۰ روپے
۳- جمہوریت' پارلیمنٹ اور اسلام: ۴۴۴ صفحات - قیمت ۱۲۰ روپے
۴- پاکستانی سیاست اور آئین: ۴۱۲ صفحات' قیمت ۱۲۰ روپے

از پروفیسر خورشید احمد مرتبین: سجاول خان رانجھا' مسلم سجاد' خالد رحمن - ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز' مرکز ایف ۷' نصر چیمبر' اسلام آباد۔

یہ سینٹ آف پاکستان میں کی جانے والی تقریروں کے انتخاب پر مشتمل مجموعے ہیں۔ گویا ایک ہی سلسلے کے چار حصے ہیں۔ چاروں کتب کو موضوعات کی مناسبت سے الگ الگ مدون کیا گیا ہے۔

پاکستان کا قیام جن ارفع و اعلیٰ مقاصد کے لیے عمل میں لایا گیا تھا' بدقسمتی سے' ہمارا نصف صدی پر محیط' اب تک کا اجتماعی سفر' ان مقاصد کی سمت کسی پیش رفت کا حامل نہیں ہے۔ علاوہ دیگر اسباب کے' اس بدقسمتی کا ایک بڑا سبب ہمارے ہاں قومی اداروں کی زندگیوں کا عدم تسلسل ہے۔ قومیں اور معاشرے قومی اداروں کے تسلسل اور ان کی مثبت روایات کے جلو میں آگے بڑھتے ہیں۔ اگر معاشی' معاشرتی' سماجی اور سیاسی ادارے روبہ زوال ہوں' قائم ہی نہ رہ سکیں یا ناقابل رشک روایات کے نمونے بن جائیں تو قوموں کی حالت ایسی ہی ہوا کرتی ہے جیسی کچھ اب ہماری ہے۔

ہمارے سیاسی اداروں پر ۱۹۵۲' ۱۹۵۸' ۱۹۶۹ اور ۱۹۷۷ میں جو کچھ گزری ہے' اس کی روشنی میں سیاسی اداروں کے اضمحلال کے اسباب بخوبی سمجھے جاسکتے ہیں۔ ۱۹۷۳ کے متفقہ دستور کی رو سے اسلامی جمہوریہ پاکستان کی دو ایوانی مقننہ میں سینٹ آف پاکستان کو ایوان بالا قرار دیا گیا اور اسی دستور کے آرٹیکل ۵۹ کی شق ۳ میں اس ادارے کو غیر تحلیل پذیر قرار دیا گیا۔ لیکن برا ہو اقتدار کے دست آز کا' جس نے ۱۹۷۷ میں اس ادارے کو بھی تحلیل کر ڈالا۔ بہرحال آٹھ برس کے تعطل کے بعد ۱۹۸۵ میں یہ محترم ادارہ بحال ہوا' اور اب تک مسلسل اپنے فرائض کی بجا آوری میں مصروف ہے۔

پروفیسر خورشید احمد' ۱۹۸۵ سے اب تک سینٹ کے رکن منتخب ہوتے چلے آرہے ہیں۔ اس کے

ساتھ ساتھ وہ دنیا کے اور بہت سے علمی ' تحقیقی اور معاشی اداروں سے بھی ذمہ دارانہ حیثیتوں سے وابستہ ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی سولہ اردو اور اٹھارہ انگریزی تصانیف بھی شائع ہو چکی ہیں۔ دنیا کی مختلف زبانوں: مثلاً عربی ' فرانسیسی ' ترکی ' بنگالی ' جاپانی ' یوگوسلاوی ' جرمن ' انڈونیشی ' ہندی ' چینی ' کورین اور فارسی میں ان کی کتابوں کے تراجم بھی ہو چکے ہیں۔

سینٹ آف پاکستان میں ان کی تقاریر کے زیر تبصرہ مجموعوں میں پہلے حصے (پاکستان میں نفاذ اسلام) میں اسلامی ریاست ' اسلامی نظریاتی کونسل ' شریعت کی بالادستی اور نظام زکوۃ کے نفاذ کے موضوعات پر تقاریر شامل ہیں۔ پروفیسر صاحب نے اس امر پر زور دیا ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں شریعت کی بالادستی قائم کیے بغیر نہ تو مطلوبہ اسلامی معاشرہ وجود میں آسکتا ہے اور نہ پاکستان نمونے کی اسلامی ریاست بن سکتا ہے ' جو قیام پاکستان کی غرض و غایت تھی۔

دوسرے حصے (پاکستان ' بھارت اور عالم اسلام) میں خارجہ پالیسی ' افغانستان ' بھارت ' کشمیر اور عالم اسلام کے اہم مسائل اور بحیثیت مجموعی پاکستان کی خارجہ پالیسی کی تشکیل نو کے لیے رہنما اصولوں پر مفصل اظہار خیال ملتا ہے۔ خورشید صاحب کا خیال ہے کہ ایک نظریاتی ریاست کی حیثیت سے ہماری خارجہ پالیسی کا ہدف ایک عادلانہ عالمی نظام کا قیام ہونا چاہیے۔ اسی طرح ہماری "اسلامی خارجہ پالیسی کو غیر فرقہ وارانہ ہونا چاہیے۔ ہمیں اسلامی حدود میں ایسے طریقہ کار وضع کرنا چاہییں جن سے پاکستان اور افغانستان میں شیعہ اقلیت اور ایران میں سنی اقلیت کے حقوق کو تحفظ اور ضمانت ملے اور یہ ملک اسلامی ہم مقصدیت کے باب میں باہم رواداری کی ایک روشن مثال قائم کر سکیں"۔ (ص ۱۸)۔

تیسرے حصے (جمہوریت ' پارلیمنٹ اور اسلام) میں سیاسی جماعتوں کی بحالی ' آٹھویں ترمیم اور متعلقہ معاہدہ ' نوکر شاہی اور جمہوری روایات ' جائزہ و احتساب (جونیجو ' پی پی پی اور آئی جے آئی کی حکومتیں) آزادی اظہار اور امن عامہ کے مسائل پر بحث شامل ہے۔ یہ بحث محض نظری نہیں ' بلکہ اس میں ملک و قوم کو درپیش عملی مسائل سے بھی تعرض کیا گیا ہے۔ پاکستان کی گذشتہ دس سالہ سیاست کے نشیب و فراز کی اس داستان سے ' سینٹ میں جمہوریت ' پارلیمنٹ اور خود نظریہ پاکستان کے تحفظ کے لیے ' پروفیسر خورشید احمد کی کاوشوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

چوتھا اور آخری حصہ (پاکستانی سیاست اور آئین) وفاق اور صوبوں کے تعلقات ' صدر کے صوابدیدی اختیارات ' دستور اور تعبیر دستور اور سینٹ کا کردار ' ایسے موضوعات پر پروفیسر موصوف کی تقاریر کا مجموعہ ہے۔

ہر تقریر میں متعلقہ موضوع کی جزئیات تک کا احاطہ کیا گیا ہے۔ پروفیسر صاحب زیر بحث موضوع کو اس کے وسیع تاریخی تناظر میں دیکھتے ہیں اور مختلف ادوار میں اس کی بدلتی ہوئی شکلوں کا جائزہ لیتے ہوئے

اس کی آخری صورت تک پہنچتے ہیں۔ یہ انداز کسی سیاست دان کی بجائے ایک ایسے اسکالر کا ہے' جو اپنے موضوع سے بخوبی واقفیت کے ساتھ اظہار خیال پر بھی قدرت رکھتا ہو۔ قاری کے لیے یہ امر باعث مسرت ہے کہ ان مجموعوں کی ہر تقریر بہت محنت' توجہ اور لگن سے تیار کی گئی ہے۔ تاریخی حوالوں اقتباسات اور تقابلی جائزوں نے ان تقاریر کو وقتی موضوعات پر ہونے کے باوجود مستقل اہمیت کی چیز بنا دیا ہے۔ ہمارے ہاں اول تو سیاسی فورموں پر اس قدر سنجیدگی اور محنت کے ساتھ تقریریں کرنے کا رواج ہی نہیں ہے' اور پھر اس نوع کی تقریروں کو تحریری طور پر محفوظ کرنے کا چلن تو بالکل ہی نہیں ہے۔ سوائے چند گنی چنی مثالوں کے' (علامہ اقبال' قائداعظم میاں افتخار الدین اور مولانا عبدالحق کی تقریریں مدون و شائع کی جا چکی ہیں)۔ ہم اس نوع کے کسی مجموعے کا نام نہیں لے سکتے۔

ان مجموعوں میں اس قدر وسیع دوائر اور اتنے متنوع موضوعات پر کلام کیا گیا ہے کہ ایک قاری اگر کہیں مصنف کے نقطہ نظر سے اختلاف محسوس کرے تو یہ امر بالکل قدرتی ہوگا' مگر اس میں شبہ نہیں کہ پروفیسر خورشید احمد کی تقاریر کے یہ مجموعے اپنے موضوعات کے ساتھ ان کی گہری دلچسپی' سنجیدگی اور اخلاص کے مظہر ہیں۔ ان مجموعوں کو بلا تامل ہماری سیاسی و ملی تاریخ کی ایک اہم دستاویز قرار دیا جا سکتا ہے۔

یہ چاروں مجموعے نہایت خوب صورت گٹ اپ کے ساتھ بہت اہتمام سے شائع کیے گئے ہیں۔ مضبوط اور مطلا جلدیں' دیدہ زیب گرد پوش' کمپیوٹر کی کمپوزنگ اور آفسٹ کاغذ نے حسن طباعت کا ایک معیار قائم کیا ہے۔ کہیں کہیں کتابت اور تدوین کی بعض خامیاں نظر آتی ہیں اور اس کے ساتھ وضاحتی اور تعارفی حاشیوں کی کمی بھی نظر آتی ہے مصنف نے ہر مجموعے کے پیش لفظ میں بالالتزام مرتبین کی "محنت" اور "عرق ریزی" کا ذکر کیا ہے اور اسی سے مرتبین کے ناموں کا پتا چلتا ہے' مگر تعجب ہے کہ مرتبین کے نام' کتاب کے اندرونی یا بیرونی سرورق' پرنٹ لائن کے صفحے یا خود مرتبین کی تحریر کردہ تمہیدی سطور کے آخر میں' کہیں درج نہیں ہیں۔ یہ تدوینی سقم اصلاح طلب ہے۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ علم سیاست' تاریخ اور سماجیات کے طالب علموں کے لیے' متعلقہ مسائل کی تفہیم اور صحیح نتائج تک پہنچنے کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ (زاہد منیر عامر)

سید مودودی کے جانشین اول' میاں طفیل محمد: مرتب۔ پروفیسر کریم بخش نظامانی۔ تسنیم پبلی کیشنز' چوک اردو بازار' لاہور صفحات ۲۹۳۔ قیمت ۱۵۰روپے۔

۱۹۳۹ میں ایک نوجوان وکیل نے مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر سن کر ان سے سوال کیا "خدارا مجھے بتایئے کہ ان حالات میں مخلص نوجوان کدھر جائیں؟" شاہ صاحب کا جواب تھا: "بھائی

وکیل صاحب ' ایمان کی پوچھتے ہو تو سچی بات وہی ہے جو مودودی کہتا ہے۔ باقی سب دنیا اور پیٹ کے دھندے ہیں ' اس لیے اگر ایمانداری سے دین کی خدمت کرنا چاہتے ہو تو اس سید کے پاس جاؤ' (ص ۸۸)۔ پھر کیا تھا' گویا کہ انھوں نے اپنی منزل پالی۔ ۲۶ اگست ۱۹۴۱ کو حلف رکنیت اٹھایا۔ تحریک کو علی وجہ البصیرت قبول کرنے کا اعلان کیا اور پھر ساری عمر کے لیے 'اسی کے ہو رہے۔

۴ نومبر ۱۹۸۷ کو محترم قاضی حسین احمد کے حلف امارت اٹھانے کے موقع پر میاں صاحب نے جماعت اسلامی سے اپنے تعلق کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''میں روز تاسیس سے جماعت اسلامی میں شامل ہوں۔ میں آج جامع مسجد منصورہ میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے ساری زندگی میں جماعت کے کام کے سوا کسی اور کام میں دلچسپی نہیں لی ' کسی ذاتی کام یا کسی خاندانی مسئلے یا دنیاوی مصروفیت سے خود کو دور رکھا ' اپنا سارا وقت ' محنت ' صلاحیت اور قابلیت جماعت کے لیے وقف رکھی''۔

تحریک اسلامی سے وابستگی میں یکسوئی ' درویشانہ افتادِ طبع ' للہیت ' بے لوثی و بے نفسی اور عجز و انکسار کو میاں طفیل محمد کی شخصیت کے اہم عناصر کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ ان کی بے نفسی کا عالم دیکھیں کہ جب زیر نظر کتاب کے مرتب ان سے انٹرویو لینے جاتے ہیں ' تو جواب ملتا ہے: ''نظامانی صاحب ' اس دنیا سے ہمیں یوں ہی جانے دیجیے۔'' (ص - ۱۲) اور یہ واقعہ کتنا عجیب اور سبق آموز ہے: ''میں دارالاسلام میں مستقل قیام کے پروگرام کے ساتھ ستمبر کی ایک خنک شام سرنا ریلوے اسٹیشن پر بھاری بھرکم گرم بستر اور ایک ٹرنک کے ساتھ پلیٹ فارم پر اترا کہ اچانک ایک صاحب نے میرا بستر السلام علیکم کی گرم جوش آواز کے ساتھ اپنے کندھے پر اٹھا لیا۔ وہ کل ہند جماعت اسلامی کے سیکرٹری جنرل طفیل محمد تھے۔'' (راوی عبدالوحید خاں)

اصول پسندی کی خاطر میاں صاحب نے آٹھ مرتبہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں ' مگر ان کے عزم و استقامت میں کبھی کمی نہیں آئی۔ بھٹو دور میں ایک موقع پر جب میاں صاحب زیادتی کا نشانہ بننے والے تھے ' فرمایا: ''میری طرف سے جاکر اس سے کہہ دو کہ فلاں جگہ پر میرا ایک مختصر سا مکان ہے اور فلاں فلاں جگہ میری ملکیتی اراضی ہے ' وہ جو کچھ مجھ سے چھین سکتا ہے ' چھین لے۔ میرے اعزہ و اقربا پر زیادتی کر سکتا ہے ' کر لے۔ لیکن یہ غلط فہمی اپنے دل سے نکال دے کہ اس کے اس قسم کے اقدامات سے میں اپنے موقف میں یا اپنے طرز فکر میں ذرہ بھر تبدیلی کر لوں گا۔'' (ص ۲۸۸)

میاں صاحب کی شخصیت اور خدمات پر مضامین کا یہ مجموعہ پروفیسر کریم بخش نظامانی نے بڑی محبت اور محنت و کاوش سے مرتب کیا ہے۔ لکھنے اور تاثرات پیش کرنے والوں میں مولانا فتح محمد ' جناب نعیم صدیقی ' ملک غلام علی ' مولانا گلزار احمد مظاہری ' جناب عبدالوحید خان ' محمد اکرم رانجھا ' حافظ محمد ادریس اور جناب مصطفیٰ صادق شامل ہیں۔

مولانا فتح محمد نے بڑی محنت سے مختلف حقائق جمع کیے ہیں اور اکرم رانجھا صاحب نے میاں صاحب کی دل نواز و دل کش شخصیت اور ان کے داعیانہ کردار کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ ان کے بقول: ''محترم میاں صاحب ' مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ''جیسے شجر سایہ دار سے فیض یاب ہوئے اور ان کی راہنمائی کو پورے طور پر جذب کیا۔ اور اس کتاب کا مقصد میاں صاحب کی ذات سے محض اظہار محبت و عقیدت نہیں 'بلکہ ان کے کام ' ان کی حکمت اور انہماک کے اسی انداز کو پیش کرنا ہے جس سے تحریک اسلامی کے وابستگان اپنے لیے رہنمائی حاصل کر سکیں۔''

آخر میں پروفیسر نظامانی کا تعارف بھی شامل کتاب ہے۔ کتاب کا معیار طباعت و اشاعت اطمینان بخش ہے۔ کاغذی جلد (پیپر بیک) اچھی ' سرورق جاذب نظر اور قیمت بہت مناسب ہے۔ (ڈاکٹر منصور علی)

نیو ورلڈ آرڈر: امجد حیات ملک۔ ناشر: احمد حیات ملک 'مصنف ۲۴۳ بی نیو چوبرجی پارک ' لاہور۔ صفحات ۲۱۷۔ قیمت ۱۵۰ روپے۔

اکتوبر ۱۹۹۱ میں شائع ہونے والی زیر نظر کتاب کا بنیادی خیال یہ ہے کہ ''نیو ورلڈ آرڈر'' کی جڑیں دراصل بہت گہری ہیں ' اور اس کا مقصد مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنا اور دنیا پر عیسائیت کا سکہ جمانا ہے۔ یہودی اور عیسائی تو اس کام میں ہمیشہ سرگرم عمل تھے ' اب ہنود بھی مسلمانوں کے خلاف اس بین الاقوامی سازش میں شریک ہوگئے ہیں۔ اس دعویٰ کے حق میں دیے گئے تاریخی شواہد مصنف کے وسیع مطالعے ' اور خاصی حد تک حسن انتخاب کی عکاسی کرتے ہیں۔ کتاب کا ضمنی وضاحتی عنوان ہے: ''شیطانی آیات کی تحریک ' ماضی کے آئینے میں''۔

باب اول کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ رشدی کی انتہائی دل آزار کتاب کوئی اتفاقی واقعہ نہیں بلکہ ایک بڑے منصوبے کی کڑی ہے۔ یہاں مصنف نے ''نیو ورلڈ آرڈر'' کے اغراض و مقاصد ' محرکات اور ہتھکنڈوں کی طرف واضح اشارے بھی کیے ہیں ' جس کی ایک جھلک خلیج کی جنگ کے زمانے میں دنیا کے سامنے آئی۔ (یہ باب ۱۹۸۹ کی تحریر ہے) باقی ابواب (جو صلیبی جنگوں ' منگول حملے ' داستان اندلس ' افریقی غلاموں کی تجارت اور یہودیوں کی قومی تاریخ پر محیط ہیں) ' پہلے باب میں مذکور خیالات کے حق میں تاریخی شواہد پر مشتمل ہیں۔

آٹھ صدیوں پر محیط کفر و اسلام کی تاریخی کشمکش کو تین سو صفحات میں اس طرح سمیٹنا کہ صورت حال کی صحیح عکاسی بھی ہو ' آسان کام نہیں۔ شاید اسی مشکل کے سبب کئی اہم تاریخی واقعات کتاب میں جگہ نہیں پا سکے ' مگر دوسری طرف اندلس کی غیر متعلق تفصیلات شامل کتاب کر دی گئی ہیں۔ ۱۴۰ صفحات پر مشتمل اس باب کی طوالت سے کتاب غیر متوازن ہوگئی ہے۔

مغربی تہذیب کی تمدنی چکاچوند سے 'اور مغربی قوموں کی امداد سے متاثر مسلمانوں کی مرعوبیت ختم کرنے کے لیے جس کام کی ضرورت ہے 'اس کے لیے یہ کتاب ایک عمدہ بنیاد مہیا کر سکتی ہے 'بشرطیکہ تجزیہ و تاریخ کے کام کو ان حوالوں سے آگے بڑھایا جائے۔

۱۔ عیسائیت سے سیکولرازم کی طرف یورپ کے پانچ صدیوں کے طویل سفر کی بنا پر بہت سے لوگ یہ سوچ رکھتے ہیں کہ ماضی کا مسیحی یورپ تو ہمارا شدید دشمن تھا 'مگر آج کا لادین مغرب 'غیر عیسائیوں سے مذہبی بنیاد پر نفرت نہیں کرتا۔ لیکن زیر تبصرہ کتاب میں بار بار یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ "نیو ورلڈ آرڈر" آج بھی وہی ہے جو قرون وسطیٰ کے مسیحی اور تاریک یورپ میں تھا۔" (اگرچہ اس کے حق میں خاطر خواہ شواہد پیش نہیں کیے گئے)۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یورپ میں گذشتہ پانچ سو سالوں میں آنے والی تبدیلیوں کا سنجیدہ تجزیہ کیا جائے اور بتایا جائے کہ آخر اجتماعی زندگی سے مسیحیت کو بے دخل کر کے (لامذہب ہو جانے کے باوجود) مسلمانوں سے یورپ کی نفرت کم کیوں نہیں ہوئی؟ یعنی ایسا کیوں ہے کہ ان کی مذہبیت 'اسلام کے خلاف نفرت پیدا کرنے (یا برقرار رکھنے) کے لیے تو موثر ہوتی ہے مگر باقی معاملات میں بے اثر؟

۲۔ اس کتاب میں ایک سے زیادہ مرتبہ ایک ایسی تاریخی حقیقت کا ذکر کیا گیا ہے جس کا ادراک ہمارے ہاں تقلید مغرب کے بارے میں متوازن نقطہ نظر پیدا کرنے کے سلسلے میں خاصا موثر ہو سکتا ہے۔ جاپان نے دو سو سال تک مغربی اقوام کا تجارتی مقاطعہ کیا 'جس کے نتیجے میں جاپان ایک لمبے عرصے تک اہل مغرب کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہا۔ مگر یہی وہ دور ہے جب مغل شہنشاہ ہمارے ہاں یورپی قوموں کو تجارتی کوٹھیاں بنانے کی اجازت دے رہے تھے 'جن کا خفیہ ایجنڈا پہلے مشنری 'پھر سوداگری اور پھر فوجی تھا۔ آج ہم اہل مغرب کو دی گئی انھی مراعات (کی غلطی) کی سزا بھگت رہے ہیں۔ اس حقیقت کا محض سرسری ذکر کافی نہیں 'بلکہ اس حوالے سے مزید تجزیے اور تقلید مغرب کے بارے میں ایک حقیقت پسندانہ نقطہ نظر پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

۳۔ کتاب کے آخر میں اس بات کا تفصیلی ذکر ہے کہ یہودی قوم ظاہری سیاسی اقتدار کے بغیر محض اپنی دولت 'مختلف علوم و فنون میں مہارت اور ذرائع ابلاغ پر تسلط کے ذریعے پوری دنیا پر غلبہ حاصل کر چکی ہے۔ اس حوالے سے یہ بات قابل غور ہے کہ آج کی دنیا میں سیاست کو جو کم و کیف حاصل ہے 'کیا اس پر نظر ثانی کی ضرورت نہیں؟ خصوصاً 'کیا علمی برتری کے بغیر محض سیاسی اقتدار فی الواقع اتنا ہی اہم ہے جتنا ہم خیال کرتے ہیں اور کیا یہ خاطر خواہ نتائج کا باعث بن سکتا ہے؟

اس کتاب کا سب سے کمزور پہلو یہ ہے کہ مصنف نے مختلف واقعات و دعاوی کے حوالے نہیں دیے ہیں۔ (ڈاکٹر بلال مسعود)